Al-SHARQ
Vol: 04, Isue:02, July-Dec 2023, pp:39-55

OPEN ACCESS
Al-SHARQ
ISSN (Online): 2710-2475
ISSN (Print): 2710-3692
www.alsharqjr.com

برصغیر میں فکر مغرب کا آغاز وارتقاء اور فکر مغرب کا تجزیاتی مطالعہ

The beginning of Western thought, its evaluation and analytical study of western thought in subcontinent

Dr.Attaullah
Assistant professor Department of Islamic and Religious Studies,The University of Haripur.

Sadaqat Khan
M Phil Scholar, Department of Islamic and Religious Studies,The University of Haripur.

Dr. Syed Ayaz Ahmad
Assistant Professor, Al Ghazali University, Karachi.

Submission: 15-09-2023 *Accepted: 15-10-2023* *Published:30-12-2023*

Abstract

Western is a vast and comprehensive topic. As the civilization, tradition and culture depicts the overall thought of nation, so in order whatever western nations be, we have to accept the period of western thought. Throughout the time of Holy Prophet (SAW) himself conveyed massages to different rulers and regards. When we talk of beginning and evaluation of western thought in the subcontinent we find different opinions about it. According to an opinion the arrival of the vascodegama was the violence of "European effects" in Hindustan. But in true sense the activities of the East India company are imagined only step for western effects in subcontinent. The west not only destroyed sub content with its law. This supremacy of the west resulted in unfathomed and

CC BY

deep ties, among India and westernize found its deep roots in the various aspects of Indians. The process of this fusion begun in the last half of the 48th century but infect it were limited till 1857AD. So it can be taken as the preliminary epoch of the story, which commenced properly after 1857. It is also a fact that the East India Company which was a ruler after 1857 was connected to the British parliament after wards. Indian throne become a regal the throne of Britain and Indian life started to get affected from west directly. The research in view relates in the article the beginning evaluation and analytical study of the western thought in the subcontinent.

***Key Words**: Western thought, subcontinent, beginning and evaluation, East India Company.*

تعارف:

فکر مغرب ایک بہت ہی وسیع اور جامع عنوان ہے۔ چونکہ کسی بھی قوم کی تہذیب و تمدن اور ثقافت کا دار ومدار اس قوم کے مجموعی افکار کا عکس ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جتنی قدیم مغربی اقوام ہیں اتنا ہی مغربی افکار کا دور بھی ماننا پڑتا ہے۔ خود رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور سے مسلمانوں کا مغرب سے مقابلہ جاری رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کے مختلف حکمرانوں اور ان کے ماتحت حکمرانوں کو نامہ ہائے مبارک بھیجے۔ اگر برصغیر میں فکر مغرب کے آغاز وارتقاء کی بات کی جائے تو اس بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک رائے کے مطابق ۱۴۹۸ میں واسکو ڈے گاما کی ہندوستان آمد یورپی اثرات کا پیش خیمہ ضرور تھی۔ لیکن صحیح معنوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی کاروائیاں ہی برصغیر میں یورپی اثرات کا اولین قدم تصور کی جاسکتی ہے۔ ہندوستان کو مغرب نے نہ صرف ہتھیاروں بلکہ اپنے قانون کی مدد سے تاراج کیا۔ مغرب کی اس حکمرانی کے نتیجے میں اہل ہند اور اہل مغرب کے درمیان گہرے اور وسیع ذاتی مراسم قائم ہوئے اور مغربیت مختلف پہلوں اور سمتوں سے ہندوستانیوں کی روح میں سرایت کر گئی۔ سرایت کا یہ عمل اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہوا لیکن حقیقت میں ۱۸۵۷ تک یہ اثرات محدود تھے۔ گویا یہ ایک تمہیدی دور تھا اس کہانی کا جس کا باقاعدہ آغاز ۱۸۵۷ کے بعد ہوا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی جو اب سے پہلے تک حکمران تھی اسکا رشتہ برطانوی پارلیمنٹ سے ہو گیا۔ انڈیا تاج برطانیہ کے زیر اثر آگیا اور ہندوستان کی زندگی مغرب سے براہ راست متاثر ہونے لگی۔

رسول اکرم ﷺ کا مبارک دور اور مغربی تہذیب:

رسول اکرم ﷺ کے مبارک دور سے مسلمانوں کا مغرب سے مقابلہ جاری ہے۔ آپ ﷺ نے مغرب کے مختلف حکمرانوں اور ان کے ماتحت حکمرانوں کو نامہ ہائے مبارک بھیجے۔ جن میں ہرقل روم، نجاشی، مقوقص (جو مغربی رومی سلطنت کا ماتحت مصری حکمران تھا) ان کے علاوہ بھی جن حکمرانوں کو نامہ مبارک بھیجے گئے وہ ان ہی کے نمائندے تھے۔

خلفائے راشدین کا دور:

مغرب سے صحیح معنوں میں ٹکراؤ خلفائے راشدین کے دور میں ہوا۔ سپین میں صلیبی جنگوں کے بعد یہ مقابلہ جاری

رہا۔ جنوبی یورپ اس کا سبب رہا۔ بعدازاں سامراجیت اور ایسٹ انڈیا کمپنیوں سے مقابلہ ہوتا رہا جو آج تک جاری ہے۔ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ یہودیت اور عیسائیت سے یہ مقابلہ پہلے دن سے جاری ہے۔ مکی دور میں ہی بالواسطہ طور پر یہودیوں اور عیسائیوں سے پالا اور واسطہ پڑ گیا۔ قرآن مجید نے وقتاً فوقتاً اہل کتاب کے بارے میں احکامات نازل ہوتے رہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو آئندہ کے حالات کے لیے تیار کرنا تھا۔

مغربی ذہنیت اور مزاج سے آگاہی کی اہمیت:

ہمارے لیے مغرب کی ذہنیت اور انداز فکر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مغربی تاریخ کے ان گوشوں اور پہلوؤں کو مدنظر رکھیں جن سے مغربی ذہنیت، مزاج اور ان کی اجتماعی نفسیات نے تشکیل پائی۔ اس کے بغیر نہ تو مغرب کے مزاج اور ذہنیت کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ان کی اجتماعی نفسیات کو۔ اس کے بغیر ہم ان سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔

یونانی عقلیات، یونانی افکار، رومی تہذیب و تمدن، مسیحیت، متھرازم اور سینٹ پال کے افکار کا تعلق مغرب کے قدیم فکری پس منظر اور مغربی تہذیب کی بنیادوں میں سے ہے۔[1]

مغرب سے مقابلے کی کیفیت:

مغرب سے ہمارا سابقہ ایک طویل عرصے سے چلا آتا ہے۔ اس میں مسلسل نشیب و فراز آتے ہیں۔ فراز کم آتے ہیں اور نشیب زیادہ۔ اب جو آئندہ نشیب آتے دکھائی دیتے ہیں وہ نشیب سے زیادہ گہری کھائی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کو نشیب کہنا مناسب نہ ہوگا۔ ابھی تک صورت یہ تھی کہ دنیائے اسلام میں استعماری ایجنڈا تھا حکومتیں مغرب کے اشاروں پر چلتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلم ممالک کی حکومتوں میں جو لوگ کارفرما ہیں ان کی خاصی بڑی تعداد وہ ہے جو مغرب کے ذہن سے سوچتی ہے۔ مغرب کے مفادات کی تکمیل میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لیے تیار رہتی ہے۔ اس طرح ان کے ذریعے مغربی مفادات کے پورا ہونے کا سامان ہو جاتا ہے۔ اس کے معاوضے میں یہ ان کے کارندوں کو مفادات بھی ملتے رہتے ہیں۔ یہ بات محض اتفاق نہیں ہے کہ ہمارے ہاں جو اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہوتا ہے اس کے بچے پہلے سے امریکہ اور کنیڈا میں جا کر آباد ہو جاتے ہیں۔ ان کو بڑے بڑے مکانات مل جاتے ہیں۔ بڑی بڑی نوکریاں ریٹائرمنٹ سے پہلے ان کے لیے تیار ہوتی ہیں۔ ان سے بڑے ماہرین خود یورپ کے پاس موجود ہوتے ہیں، اس کے باوجود انہیں کیوں پالا جاتا ہے؟ انہیں مغرب میں کیوں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے؟ آپ خود غور کر لیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟[2]

۱۴۹۸ء میں واسکوڈے گاما کی ہندوستان آمد ۳، ایسٹ انڈیا کمپنی:

واسکوڈے گاما کی ہندوستان آمد یورپی اثرات کا پیش خیمہ ضرور تھی لیکن صحیح معنوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی کاروائیاں ہی برصغیر میں یورپی اثرات کا اولین قدم تصور کی جاسکتی ہیں۔[4]

ہندوستان کو مغرب نے نہ صرف اپنے ہتھیاروں بلکہ اپنے قانون کی مدد سے تاراج کیا[5]۔

مغرب کی اس حکمرانی کے نتیجے میں اہل ہند اور اہل مغرب کے درمیان گہرے اور وسیع ذاتی مراسم قائم ہوئے اور مغربیت مختلف پہلوؤں اور سمتوں سے ہندوستانیوں کی روح میں سرایت کر گئی۔ سرایت کا یہ عمل اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہوا۔[6] لیکن درحقیقت ۱۸۵۷ء تک یہ اثرات محدود تھے۔[7]

گویا یہ ایک تمہیدی دور تھا۔اس کہانی کا باقاعدہ آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا۔۱۸۵۷ء کے بعد یہ تہذیب محض تاجروں کی نہیں بلکہ حکمرانوں کی بن گئی۔اس کا اثر صرف اقتصادیات اور سیاسیات تک نہیں رہا بلکہ یہ تہذیب گھروں اور دلوں میں داخل ہو گئی۔تاجری تاجوری میں بدل گئی۔[۸]

یہ بھی اہم حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی جواب سے پہلے تک حکمران تھی اس کا رشتہ برطانوی پارلیمنٹ سے ہو گیا۔انڈیا تاج برطانیہ کے زیر اثر آگیا اور ہندوستان کی زندگی مغرب سے براہ راست متاثر ہونے لگی۔

مسلم ممالک کی قیادت اور مغربی تہذیب:

مسلم ممالک پر ایسی قیادت مسلط کی گئی ہے جنہوں نے سود در سود کے چکروں میں اپنے عوام کو ڈال کر عالمی طاقتوں کا باجگزار بنادیا ہے۔اس قیادت نے مسلمانوں کی اقتصادیات کو عالمی استعمار کے قبضے میں دے دیا ہے۔انہوں نے صحت اور ترقیاتی شعبوں سمیت تمام شعبوں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے عالمی مالیاتی اداروں کے پاس گروی رکھوا کر ان سے بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا ہے۔اس طرح مغرب کے تربیت یافتہ اور کاسہ لیس مسلم حکمران اہل اسلام کی رسوائی کا سبب بن گئی ہے اور ان کی غیرت وحمیت کی پامالی کا بھی۔اس طرح مسلم ممالک میں وہی پالیسیاں نافذ ہوئیں جن سے مغربی طاقتوں نے ان کی معیشت، سیاست، تعلیم، خارجہ پالیسی کو اپنے کنٹرول میں رکھا۔ایسی پالیسیوں کے نتیجے میں مسلمانوں میں کئی اخلاقی عیوب پیدا ہو گئے۔اس کے علاوہ اپنے وسائل کو بروئے کار لانے کی صلاحتیوں سے بھی محروم ہو گئے۔اس کے علاوہ مسلمان اپنے دفاع کے لیے منصوبہ بندی کے قابل بھی نہ رہے۔[۹]

برصغیر پر مغربی تہذیب کے اثرات:

مغربی تہذیب کے اثرات ونفوذ کی ابتدائی نشانیاں سیاست، تجارت اور مشنریوں کے ذریعے سامنے آئیں۔لیکن ان سے قطع نظر اہم ترین انقلابی قدم جدید مغربی تعلیم کا نفاذ تھا۔انیسویں صدی کی چوتھائی دہائی میں برطانوی حکومت نے خوب سوچ سمجھ کر اسلامی اور ہندی نظام کو انگریزی تعلیم سے بدل کر ہندوستانی ذہن کا رخ مغرب کی طرف موڑ دیا۔فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء، کلکتہ ہندو کالج ۱۸۱۷ء، دہلی کالج ۱۸۲۹ء وغیرہ کے ذریعے مغرب کے خیالات کی ترویج کی گئی۔بالخصوص دہلی کالج جو مشرق ومغرب کا سنگم تھا انگریزی اثرات کا سب سے بڑا منبع تھا۔[۱۰]

اس سلسلے میں لارڈ میکالے کی مشہور زمانہ یادداشت بھی قابل توجہ ہے جو اس نے فروری ۱۸۳۵ء کو پیش کی".

اس میں اس نے انگریزی زبان کے ذریعے مغربی علوم وفنون کی تعلیم کی پرزور حمایت کی اور لکھا کہ صرف چند مغربی کتابیں تمام ہندوستانی اور عرب کے ادب سے کہیں زیادہ گراں قدر ہیں۔[۱۲]

جو شخص یہ زبان جانتا ہے اسے دنیا بھر کی عقلمند ترین اقوام کے ذہنی ورثے تک رسائی ہو جاتی ہے۔[۱۳]

اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق، رائے، فہم اور اظہار کے اعتبار سے انگریز ہو۔[۱۴]

ولیم بینٹنگ ((Willium Banting نے میکالے کی یادداشت کی روشنی میں مارچ ۱۸۳۵ء کو ایک قرارداد منظور کر لی جس کی رو سے طے کیا کہ حکومت برطانیہ کا بڑا مقصد اہل ہند میں یورپی لٹریچر اور سائنس کی اشاعت ہونی چاہیے اور تمام

امدادی رقوم کا بہترین مصرف یہ ہے کہ ان کو انگریزی تعلیم پر لگایا جائے۔ یہاں تک کہ ملازمتوں میں انگریزی تعلیم کو ترجیح دینے کا فیصلہ کیا گیا۔[۱۵]

انگریزی اثرات کے تحت راجہ رام موہن (۱۷۷۲-۱۸۳۳ء) نے ۱۸۲۳ء ہی میں یہ کوشش شروع کر دی تھی ہندوستان والوں کو مشرقی زبانوں کی جگہ انگریزی زبان میں تعلیم دی جائے اور مشرقی علوم والسنہ کی بجائے مغربی علوم پڑھائے جائیں۔ راجہ رام موہن کی زندگی اور اصلاحی تحریک برہمو سماج ہندوستانی معاشرے اور ثقافت پر مغربی اثرات کا جیتا جاگتا نمونہ تھی۔[۱۶]

تاریخ ہند کے مغربی دور میں ہندو موقع شناسی میں مسلمانوں سے زیادہ تیز نکلے۔ جہاں مسلمان ایک طویل مدت تک انگریزی تعلیم اور برطانوی حکومت کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے وہاں ہندو مغربی تعلیم کی وجہ سے اقتدار میں شامل ہو گئے۔[۱۷]

ہندوستان میں انگریزی تعلیم نافذ کرنے کا مقصد جہاں کالے انگریز پیدا کرنا، حکومت کی مشینری چلانا، مغربی علوم و افکار و اقدار کو عام کرنا تھا وہاں ایک مقصد یہ بھی تھا اس سے مسیحی مذہب کی اشاعت میں سہولت ہو۔[۱۸]

مغربی نظام تعلیم جس میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی کوئی گنجائش نہ تھی، نئے تعلیمی نظام سے فائدہ نہ اٹھانے کے باعث ملازمتوں میں کم سے کم نمائندگی کا تناسب، مشنریوں کی کارگزاریاں اور حکومت کی طرف سے ان کی سرپرستی، ابتر اقتصادی حالت اور رعایا سے لاپرواہی، اقتصادی امور میں کوتاہی، فلاح و بہبود سے عدم دلچسپی، رعایا سے ذلت آمیز رویہ، اسلامی علم و فضل کی بیخ کنی، اسلام کے خلاف عیسائیت کی روایتی عداوت، قرون وسطیٰ کی دشنام طرازی، خاص طور پر پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف زہر آلودگی، قانون اور اوقاف میں مداخلت ایسے قانونی و انتظامی اقدامات جو اسلامی روایات کے خلاف تھے۔ اس کے علاوہ ہندوئوں کے برعکس مسلمان جو کئی صدیوں سے ہندوستان میں حکمران طبقے کا درجہ رکھتے تھے نفسیاتی طور پر ان انقلابات کے لیے تیار نہ تھے جو ۱۸۳۵ء میں انگریزی کو اچانک ذریعہ تعلیم بنانے کی وجہ سے رونما ہوئے۔ اور نہ ہی وہ اپنے مشتعل جذبات کو نرم کر سکے۔[۱۹]

اگرچہ اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں مسلمانوں پر مغربی اثر اور مغربی تعلیم سیکھنے کے نشانات ملتے ہیں۔ مثلاً شاہ عبدالعزیز کا وہ فتویٰ جس میں انہوں نے انگریزی پڑھنا از روئے مذہب جائز قرار دیا تھا۔ شاہ عبدالحیی کی ایک موقع پر ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت۔ اودھ کے نوابین کی سائنسی معلومات میں دلچسپی اور بالخصوص کرامت علی جونپوری (متوفی ۱۸۷۳ء) کی اسلام اور سائنس میں رابطے کی کوششیں اور دلی کالج کی نیم مغربی روشن خیالی وغیرہ۔[۲۰]

لیکن بہرحال تہذیبی و سیاسی نقطہ نظر سے ان کے نزدیک فرنگیوں کے زیر تسلط ہندوستان ''دارالحرب'' ہی تھا۔ ۲۱ چنانچہ تحریک مجاہدین اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی در حقیقت مسلمانوں کی طرف سے شدید نفرت کا اظہار تھا۔

دنیا کے ایک بڑے حصے پر ایک عرصے تک حکومت کرنے کے بعد جب مسلمان، خوفناک نفسی کمزوریوں کا شکار ہوئے اور فکر و عمل کے کے لحاظ سے جمود سے دوچار ہوئے تو مغربی تہذیب کے نمائندوں، جنہوں نے مسلم سپین کی اسلامی درسگاہوں سے علوم و فنون حاصل کیے تھے، نے اپنی قوم میں بیداری پیدا کی اور سائنسی ترقی کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد تہذیب مغرب والے ایک نئے جذبے، نئے ولولے، تنظیمی اور فوجی طاقت اور بھرپور سائنسی ترقی کے ساتھ عالم اسلام پر حملہ آور ہوئے۔ مسلم حکومتیں اخلاقی بحران اور فکری کوتاہی کی وجہ سے انتشار کا شکار ہو چکی تھیں اس لیے مغربی عسکری طاقت کے

سامنے نہ ٹھہر سکیں ۔اس طرح عالم اسلام کے بڑے حصے پر مغربی اقوام غالب ہوئیں ۔یہاں تک کہ جو مسلمان علاقے بظاہر آزاد رہے وہ بھی بالواسطہ طور پر غلام ہی رہے۔[۲۲]

دنیا کو مغربی طاقتوں کے غلبے کے اس پورے دور میں تاریخی نقصان اٹھاناپڑا۔اس دور میں انسانیت کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا اور ایک عالمی نظام تشکیل دیا گیا۔ایک گروہ میں وہ قومیں ہیں جو پسماندہ اور غلام ہیں ۔اس گروہ میں زیادہ تر مسلمان شامل ہیں ۔برطانیہ ، فرانس اور اب امریکہ نے یہ پالیسی اختیار کی ہے کہ مسلمان صرف نام کے مسلمان ہوں اور میڈیا کے طاقتور نظام اور جدید آلات وایجادات کے ذریعے ان کو بغیر لڑے فتح کرلیا جائے۔مادہ پرست مغربی طاقتوں نے مسلم ممالک کی سائنسی ترقی اور خوشحالی کے تمام دروازے بند کردیے ہیں ۔مسلم ممالک کو جدید ٹیکنالوجی تک رسائی سے بھی روک دیا گیاہے۔ان کے لیے صنعت وتجارت کے راستے بھی بند کردیے گئے ہیں ۔

برصغیر کے مسلمانوں کا ردعمل:

مغرب کے ساتھ اس کشمکش کے پنپنے میں برصغیر کے مسلمانوں میں متعدد ردعمل پیدا ہوئے جنہوں نے مختلف رجحانات کو پیدا کیا۔ان میں سے دو ردعمل نمایاں طور پر سامنے آئے اور ایک روایت پسندی کی شکل اختیار کی جو مذہب کی اصل شکل پر لوٹ جانے کا علمبردار تھا۔دوسرا رویہ جدت پسندی کا تھا۔اول الذکر کی نمائندگی دیوبندنے کی جبکہ ثانی الذکر کا علَم علی گڑھ یونیورسٹی نے تھاما۔جدت پسندی کا رویہ اس امر کا متقاضی تھا کہ مسلمانوں کے لیے دفتروں اور ملازمتوں میں کچھ رعایت لے کر مغربی فکر و نظر سے سمجھوتا کرلینا چاہیے اور مسلمانوں کو دنیوی تعلیم میں اتنا آگے نکل جانا چاہیے کہ غلام ہندوستان میں وہ کسی قوم سے پیچھے نہ رہیں ۔یہ راستہ ابتداء میں بالکل بے ضرر تھا لیکن مغربی فکر و نظر سے سمجھوتا کرتے ہوئے انجام کار اپنے ماضی سے کٹنا لازم تھا۔چنانچہ جلد ہی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عقائد افکار میں ڈھلنے لگے اور اعمال وسعت قلب کی بھینٹ چڑھنے لگے۔۲

مجدد الف ثانیؒ اور مغربی تہذیب: حکومت میں خرابی ، علمائے سوء کی باطل پرستی ، نام نہاد صوفیاء کا غلط طرز عمل یہ وہ محاذ تھے جن پر مجدد الف ثانیؒ (۱۶۲۴-۱۵۶۴) نے جہاد کیا۔آپ کے وحدۃ الشہود کے نظریے نے ہند کے مختلف سرچشموں کو ایک واحد چشمے میں بدل دیا۔طریقت وشریعت کے درمیان جو مناقشت تھی اسے ختم کرکے اتحاد واتفاق کی زنجیر میں جوڑ کر انہیں ایک ٹھوس اکائی بنادیا۔اسلام کی حقیقی روح کو اکبر کے دین الٰہی ، صوفیاء کے منفی افکار سے پاک کیا۔اسی طرح ان کی تحریک احیائے اسلام بااعتبار نوعیت سیاسی تھی جس کے اثرات ہندوستان سے باہر بھی اسلام پر مرتب ہوئے۔خصوصاً وسط ایشیا اور سلطنت عثمانیہ کے مشرقی صوبوں میں ۔اس طرح مجدد الف ثانی برصغیر کے موجودہ اسلام کے پیشرو اور رہنما تھے۔عالمگیر، شاہ ولی اللہ سرسید، اقبال ، مدرسہ دیوبند ، ابوالکلام آزاد وغیرہ ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود شیخ احمد سے متاثر تھے۔برصغیر میں جن حالات میں شیخ احمد نے تجدید کا کام کیا تقریباً وہی حالات (مغربی تصورات مثلاً علاقائی وطنیت وقومیت ، سیکولر یا لادین سیاست ومعاشرت وغیرہ کے فروغ کے سبب) عہد اقبال میں بھی پیدا ہوگئے تھے اور تجدید کے متقاضی تھے۔اسی لیے اقبال نے ان کو ہندوستان میں دوقومی نظریے کا بانی اور ملت اسلامیہ کا عظیم مصلح قرار دیا اور ان کے حوالے سے خود کو پیوستن کی بجائے گسستن" اور "سر الوصال" کی بجائے "سر الفراق" سے وابستہ کیا ہے۔[۲۳]

دو متضاد تہذیبیں:

اس وقت دنیامیں دو تہذیبیں چل رہی ہیں ۔ایک مغرب کی مادی تہذیب، دوسری انسانی فطرت سے ہم آہنگ وحی کی تعلیمات پر مبنی اسلامی تہذیب۔ یہ تہذیبیں ہر لحاظ سے ایک دوسری سے جدااور متضاد ہیں ۔ مغربی تہذیب اس دنیا کو ہی اصل سمجھتی ہے اور دنیامیں ہی سب کچھ حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔جو عقائد اور اخلاقیات انسان کی نفسانی خواہشات اور ان کی رائے سے مختلف ہیں مغربی تہذیب کی نظر میں وہ غلط ہیں اور وہ ان اخلاقی قدروں کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ مغربی تہذیب میں یہ تصور پایا جاتاہے کہ انسان اور کائنات ایک ارتقائی عمل کے ذریعے خود بخود وجود میں آئے ہیں ۔وہ انسانی فطرت میں کسی طاقتور، لطیف، پاکیزہ اور غیر مادی داعیہ سے یکسر منکر ہے۔اس کے نزدیک انسان سراپا مادی چیز ہے۔اس کی اصل حیوانیت ہے اور وہ مادی مقاصد وجذبات سے سرشار ہے۔اسی لیے زنا، شراب، خنزیر کے گوشت کا استعمال، ہم جنسی جیسے افعال اس تہذیب میں نہ صرف جائز ہیں بلکہ ان کاموں میں زندگی کا عروج ہے۔ مغربی تہذیب میں صرف ظاہر کو خوبصورت بنانے پر زور ہے اور باطن کی پاکیزگی سے انکار پایا جاتا ہے۔

برخلاف اس کے اسلامی تہذیب میں رب تعالیٰ اور آخرت کے بنیادی عقائد کے علاوہ اس زندگی کو عارضی اور امتحانی زندگی سمجھا جاتاہے۔آخرت کی تیاری کے ساتھ ساتھ اس دنیامیں انفرادی واجتماعی زندگی گزارنے کا طریقہ سکھاتی ہے۔

جب انگریز ہندوستان میں آئے اس وقت یہاں مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کاایک جامع نظام موجود تھا۔انگریز برصغیر میں ہمیشہ رہناچاہتاتھااور ہمارانظام تعلیم ان کے راستے کی بڑی رکاوٹ تھا۔چنانچہ اس نظام تعلیم وتربیت کو ختم کرنے کے لیے اس نے ایک قانون بناکر ہماری درسگاہوں کے لیے وقف شدہ تمام املاک کو بحق سرکار ضبط کرلیا۔دینی مدارس جو صدیوں سے ان املاک کے ذریعے چل رہے تھے وہ مالی لحاظ سے مفلوج ہوگئے اور ہمارا صدیوں سے قائم عظیم نظام تعلیم تباہ ہونے لگا۔اس نظام کی جگہ انگریز نے جو نظام قائم کیااس کے ذریعے وہ جو نتائج حاصل کرناچاہتاتھا، پچھلے ڈیڑھ سو سال میں اس نے صد فی صد وہی نتائج دیے ہیں ۔

جس وقت انگریز یہاں آئے اس وقت ہمارا جو نظام تعلیم قائم تھاوہ ایک ہمہ جہت اور خودکار نظام تھا۔اس نظام میں معاشرے کے تمام افراد کی بنیادی تعلیم کابندوبست ہوجاتاتھا۔یہ نظام مساجد ومدارس کے ذریعے ملک بھر میں قائم تھا۔ ۲۴ تعلیم کا یہ نظام اس قدر بہترین اور ثمرآور تھاکہ انگریز مصنفین حیرت زدہ ہیں کے خود مغرب کے پاس بھی ایسانظام موجود نہیں تھاجس سے معاشرے کے سوفیصد لوگ مستفید ہوتے۔

ایک انگریز مصنف اپنی کتاب" A Book of History of Education in Bombay Province میں لکھتاہے:

ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگوں کی شرح وہی ہے جتنی یورپ کی اقوام میں ہے۔بنگال کے ہر گاؤں میں ابتدائی تعلیم کے مدارس موجود تھے۔انیسویں صدی کے شروع میں صرف بنگال میں ایک لاکھ مدارس کام کررہے تھے۔ ۲۵

جدیدیت کاآغاز:

نئی دنیایعنی جدیدیت کاآغاز ۱۴۵۳ء سے ہوتاہے جب ترکوں نے قسطنطنیہ فتح کیااوریونانی عالم اپنی کتابیں لے

کروہاں سے بھاگے اور سارے یورپ میں پھیل گئے۔انہوں نے یونانی علوم یورپ والوں کو پڑھائے۔اس دور کو نشاۃ ثانیہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یونان اور روم کے زوال کے بعد یورپ کا ذہن گویا مر گیا تھا اور ہزار سال تک مدفون رہا۔پندرہویں صدی میں جب یونانی علوم پھیلے تو مغرب کا ذہن دوبارہ پیدا ہوا۔

مغرب کی عقلیت اور انسان پرستی، مذہب بیزاری:

نشاۃ ثانیہ کا اصلی مطلب ہے وحی پر مبنی اور نقلی علوم کو بے اختیار سمجھنا اور عقلیت اور انسان پرستی اختیار کرنا۔اسی لیے اس تحریک کا دوسرا نام انسان پرستی ((Humanism بھی ہے۔[۲۶]

اٹھارہویں صدی میں ایک نئی قسم کا مذہب نمودار ہوا، جو دراصل دہریت کی ایک شکل ہے۔اس کا نام Deism (خداشناسی) رکھا گیا ہے۔ اس دور کے لوگ کہتے تھے کہ عقل (جزوی) انسان کا جوہر خاص ہے اور یہ چیز ہر زمانے اور ہر جگہ کے انسانوں میں مشترک ہے اور ہر جگہ ایک ہی کام کرتی ہے۔چنانچہ خدا کو پہچاننے کے لیے وحی پر تکیہ کرنے کی ضرورت نہیں ، عقل (جزوی) کی مدد سے خدا تک پہنچ سکتے ہیں ۔ عقل کے ذریعے چند ایسے اصول معلوم کیے جاسکتے ہیں جو سارے مذاہب میں مشترک ہوں۔ ان اصولوں کا مجموعہ ہی اصل مذہب ہوگا۔

جب انگریز ہمارے یہاں آئے تو ان کے اثر سے یہ رجحان ہمارے برصغیر میں پہنچا۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ''خدا شناسی'' کے جو میلے انگریزوں نے کرائے ان کے پیچھے یہی رجحان تھا۔ہندوان سے بہت متاثر ہوئے اور انیسویں صدی کے شروع میں راجارام موہن رائے نے جو ''برہمو سماج'' کی بنیاد ڈالی وہ اسی اثر کا نتیجہ تھا۔مسلمان بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔۱۸۳۶ء میں کمبل پوش نے یورپ کا سفر کیا تھا اور دس سال بعد اپنا سفر نامہ لکھا۔ان کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ جانے سے پہلے ہی وہ ''خداشناسی'' سے متاثر ہو چکے تھے۔اس کا نام انہوں نے ''سلیمانی مذہب'' رکھا ہے۔[۲۷]

عقلیت پرستی کا دور:

عقلیت پرستی کا دور سترہویں صدی کے وسط سے شروع ہو کر اٹھارہویں صدی کے وسط تک یا ۱۷۷۵ء تک چلتا ہے۔۱۷۵۰ء کے قریب ایک دوسرا رجحان جذبات پرستی کا شروع ہو چکا تھا۔

عقلیت پرستی کے دور کی ایک مرکزی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے انسانی زندگی اور انسانی فکر میں سب سے اونچی جگہ معاشرے کو دی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ فرد کو اپنے ہر فعل اور قول میں معاشرے کا پابند ہونا چاہیے۔یہ لوگ مذہب کو بھی صرف اسی حد تک قبول کرتے تھے جس حد تک کہ مذہب معاشرے کے انضباط میں معاون ہو سکتا ہے۔غرض معاشرے کو بالکل خدا کی حیثیت دے دی گئی تھی (نعوذ باللہ) اس کے خلاف رد عمل انیسویں صدی میں ہوا اور معاشرے کے بجائے فرد کو اہمیت دی گئی۔ بیسویں صدی میں اشتراکیت کے زیر اثر بعض لوگ معاشرے کو پھر خدا ماننے لگے۔

مغربی فکر میں جس طرح روح اور مادے، ذہن اور جسم، عقل اور جذبے کے درمیان مسلسل کشمکش جاری ہے اسی طرح معاشرے اور فرد کی کشمکش بھی بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا بھی کوئی حل نہیں ملتا۔مغرب میں جو معاشرتی انتشار پھیلا ہوا ہے اور روز بروز بڑھتا جارہا ہے اس کی جڑ یہی تضاد ہے۔

اسلام اور تہذیب جدید:

جب اسلام کا حال خود اس کے اپنے گھر میں یہ ہو گیا ہو اور وہ اپنے وطن ہی میں مختلف پہلوؤں سے اس حد تک غریب اور اجنبی بن چکا ہو تو باہر کی دنیا میں اس کی غربت اور اجنبیت کا جو بھی حال نہ ہو جاتا کم ہی تھا۔ جب اس دین کے پیرو جاہلیت کی یلغاروں سے خود اپنا تحفظ نہ کر سکے تو وہ دوسروں کو اس کی غارت گری کے خلاف کیا مدد پہنچا سکتے تھے۔ اس لیے اسے وہاں ہر طرف میدان کھلا مل گیا اور وہ اپنی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرتی چلی گئی جس کے فطری نتیجے میں باہر کی پوری دنیا اسلام سے بے گانہ ہو کر رہ گئی۔ نہ اس کی حقیقت سے واقف نہ اس کی صورت سے شناسا۔

اسلام اور مغربی تہذیب:

جاہلیت جدیدہ کی علم بردار ی مغربی تہذیب کر رہی ہے۔ اس تہذیب کی بنیاد یورپ کے صنعتی انقلاب نے ڈالی تھی اور خود اس انقلاب کی داغ بیل فکر و نظر کی اس آزادی کا صدقہ تھی جو مغرب کو اسلام کے طفیل ملی تھی۔ مگر جاہلیت کی خوش قسمتی کہ اس تہذیب نے اسلام کی اس ایک چیز کو تو لے لیا مگر اس کی مزید قدر شناسی نہ کی اور اس کی تعلیمات سے یکسر بے نیازی برتتے ہوئے اپنے من مانے رُخ پر آگے قدم بڑھاتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اسے اسلام سے عناد اور توحش کا روگ بری طرح چمٹا ہوا تھا۔ اس عناد اور توحش نے اُسے اسلام سے، اسلامی تصور حیات سے اور اسلامی اصول واقدار سے بیگانہ کر ڈالا۔ اس بیگانہ پن کو ایک بیرونی انقلابِ فکر نے اور بڑھاوا دے دیا اور اسے انتہاء پر پہنچا دیا۔ یہ فکری انقلاب عیسائیت کی زبوں حالی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اس دور میں جو عیسائیت رائج تھی وہ بے جان اور محرف عیسائیت تھی اور عقلیت وآزادی فکر کا گلا بری طرح دبوچے ہوئے تھی۔

جب اسلام کی بدولت ملی ہوئی روشنی پا کر یورپ نے اوہام کے اندھیرے سے نکلنا چاہا تو اس نے خشمناک ہو کر اس کی مخالفت کی۔[۲۸]

مغربی تہذیب اور سائنسی نظریات:

ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے اور اس نظریے کی ترجمان کتاب ''اصل الانواع'' نے جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی تھی اس نظریے کو ایسا مقام دے دیا گویا وہ ایک سائنٹفک حقیقت ہے جسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ نظریہ ہے جس کے پیٹ سے مغرب کے موجودہ نظام تہذیب کا، اس کے معاشی تصورات کا، اس کے اخلاقی نظریات کا، اس کے معاشرتی اصولوں کا اور اس کے سیاسی افکار کا جنم ہوا ہے۔ فاشزم بھی اس کی پیداوار ہے، ظالمانہ سرمایہ پرستی اور اشتراکیت کی خاردار جھاڑیاں بھی اس کی جڑ سے نکلی ہیں۔ غرض زندگی کا پورا نظام فکر و عمل، عقل سلیم اور فطرت صحیح کے تقاضوں کو ٹھکرا کر مادیت اور بے دینی کی بنیادوں پر کھڑا کر دیا گیا۔ اور بھرپور دنیا میں اس کا سکہ جاری ہوتا چلا گیا۔

یہ صحیح ہے کہ باہر کی پوری دنیا اس تہذیب کی دہریت اور خدا بیزاری سے اتفاق نہیں رکھتی بلکہ اکثریت خدا اور مذہب کی قائل ہی نہیں ہے۔ مگر اسلام کی حد تک اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ یہ تہذیب کوئی معمولی قسم کی اور محدود حلقہ اثر رکھنے والی تہذیب نہیں ہے۔[۲۹]

قرآن کریم کی باتوں کو سن کر ان کے دانش وروں، پر تمسخر کا وہی دورہ پڑ جاتا ہے جو چودہ سو اچودہ سو برس پہلے کے جہلا پر پڑ جایا کرتا تھا۔ دین حنیف کی پاکیزہ اور بلند تعلیمات کی سمائی جس طرح ساتویں صدی عیسوی کے عربوں کے تنگ

وتاریک دماغوں میں نہیں ہو پارہی تھی اسی طرح بیسویں صدی کے وسیع النظر اور روشن دماغوں میں بھی نہیں ہو رہی ہے۔ دنیا کی فکر رسا اپنی حیرت انگیز اڑانوں کے باوجود توحید، آخرت اور رسالت کے بارے میں ویسی ہی بے بال وپر دکھائی دیتی ہے جیسی کہ پرانی جاہلیت تھی۔[۳۰]

مغربی تہذیب یا جاہلیتِ جدیدہ؟:

جدید جاہلیت جس کا معروف نام جدید تہذیب ہے، اسلام کے بارے میں کیا ذہن رکھتی ہے؟ اسے کس نگاہ سے دیکھتی ہے؟ اور اسلام اس کے لیے کتنا قابل فہم ہے؟ اس بحث سے تعلق رکھنے والے حقائق بھی معلوم ومشہور ہیں اور نظائر وشواہد بھی موجود ہیں۔

اس تہذیب کی بعض افادیتوں اور خوبیوں کا انکار نہیں لیکن سوال یہاں ٹہنیوں اور پتوں کا نہیں ہے بلکہ جڑوں اور پھلوں کا ہے اور کوئی بھی صاحب نظر بشرطیکہ اس کا ذہن مغرب سے مرعوب نہ ہو اس تہذیب کی جڑوں کو صالح قرار نہیں دے سکتا۔ نہ اس کے پھلوں کو خوش گوار کہہ سکتا تھا کیونکہ ان جڑوں کو جس بیج نے جنم دیا ہے وہ خالص جاہلیت کا بیج ہے۔ اور اس دور کی جاہلیت اتنی مثالی ہے کہ پرانی جاہلیتوں میں سے کوئی بھی اس کی ہم سری نہیں کر سکتی۔ پرانی جاہلیت کا جوہر حیات یا تو شرک ہوتا تھا یا کفر، آخرت کا انکار ہوتا تھا یا شفاعت کا من بھاتا عقیدہ۔ جبکہ یہ ترقی یافتہ جاہلیت خدا کی ہستی کے انکار سے وجود میں آئی ہے۔ جب اسلام کی بنیاد خدا کے ایمان کامل پر اور اس جاہلیت کی بنیاد خدا کے انکارِ مطلق پر ہے، تو یقینی بات ہے کہ یہ دونوں فکر وعمل کے میدان میں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔[۳۱]

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح مٹھاس میں ایک خاص ڈگری سے آگے بڑھ جانے پر تلخی محسوس ہونے لگتی ہے اسی طرح دولت اور عیش کی حد سے بڑھی ہوئی نام نہاد مٹھاس بھی انسانی فطرت کے لیے خوش گوار نہیں رہ جاتی اور وہ اسے اگلنا شروع کر دیتی ہے۔ موجودہ مادی تہذیب انسان کو اسی صورت حال سے دوچار کرنے لگی ہے۔ سامان عیش کی ظاہری بہتات اندر کی مفلسی میں تبدیل ہو گئی ہے۔ ایک پہلو سے یہی انجام مادی قوت کی بے محابا ترقی کا بھی ہو رہا ہے۔ اس ترقی کو سکون اور راحت کی ضمانت سمجھا جاتا تھا مگر ہوا یہ کہ وہ اپنے پیٹ سے بے چینی اور خوف زدگی کو جنم دے رہی ہے۔ امریکہ اور روس کی سپر پاورز کو دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ کسی اچانک ایٹمی حملے کے اندیشوں نے ان کی نیند اڑا رکھی ہے۔[۳۲]

مغرب اپنی شیطانی ذہانت سے کام لے کر برابر نئے، نرم، خوشنما، الفاظ کا جال پھیلاتا جاتا ہے اور بھولا بھالا سادہ دل مشرق برابر اس جال میں پھنستا چلا جاتا اور جرم ومعصیت میں گرفتاری کے لیے راستہ صاف کرتا جاتا ہے۔ اس خاص مفہوم کے لیے جو لفظ اب تک اردو میں چلے ہوئے تھے وہی بالکل ٹھیک تھے۔ لیکن اگر انہیں یہ سمجھ کر کوئی نیا لفظ انگریزی لفظ کے مقابل رکھنا ہی ہے تو وہ "تلذز بالمثل" ہو سکتا ہے۔ اس میں "تلذذ" Sexuality کے اظہار کے لیے ہے۔ ہم جنسی اس موقع کے لیے تمام تر مہمل ہے۔

فکر مغرب کا تجزیاتی مطالعہ

جب سے انسان وجود میں آیا ہے زیادہ تر عرصے کے دوران تہذیبوں کے درمیان تعلق نہ ہونے کے برابر تھے یا بہت محدود تھے۔ تعلقات میں کمی کی وجہ یہ ہے کہ تہذیبوں کے درمیاں زمان ومکان کے فاصلے حائل تھے۔ تہذیبوں میں ڈرامائی

رابطے کا ایک اہم موڑ اسلامی تہذیب کے ابھرنے سے پیدا ہوا۔ اسلام ساتویں صدی عیسوی میں جزیرہ نمائے عرب میں ابھرنے کے بعد شمالی افریقہ، وسط ایشیا، برصغیر اور جنوب مشرقی ایشیا میں تیزی کے ساتھ پھیلتا چلا گیا۔ مسلم تہذیب نے فتوحات، تجارت، علم، تبلیغ اور اخلاق کے ذریعے دوسری تہذیبوں بالخصوص ہندی اور مغربی تہزیب کو متاثر کیا۔ مسلم تہذیب کے روُذیر ہونے کے بعد اسلام ایک عالمی نظام اور عالمگیر ریاست تو بن گیا لیکن عالمی تہذیب نہ بن سکا۔ اسکی ایک وجہ تو دیگر قوموں کی تنگ نظری، جہالت اور تعصب تھا (مثلا یورپ کی تنگ نظری) اسکے علاوہ زمان و مکان کے فاصلے اور دستیاب ذرائع نقل و حمل کا محدود ہونا بھی تھا۔

مغرب جو ۱۵۰۰ء سے قبل تک اسلامی تہذیب سے رابطے میں آنے کے باوجود، اسلامی سائنس و ثقافت سے استفادے کے باوجود جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ۱۵۰۰ء کے بعد اس کے ثمرات نمایاں طور پر سامنے آگئے۔ اور تہذیبوں کے کے مابین تعلقات جو محدود تھے یا کم کم تھے یا کبھی کبھار جو ٹکرائو تھا وہ سب کچھ مغربی تہذیب کے مستقل اثرات میں بدل گیا۔

مغرب ایک جغرفیائی سمت ہی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک مکمل تصویر ہے۔ بالفاظ دیگر پوری مغربی تہذیب کی علامت ہے۔

مغربی تہذیب کی پیدائش ۷۰۰ یا ۸۰۰ کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ جسکی جڑیں یونان اور روم کی قدیم تہذیبوں میں پیوست ہیں۔ مغربی تہذیب کا پھیلائو حیرت انگیز ہے۔ مغربی اور غیر مغربی معاشرے اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ یورپی یونین جو یورپ میں مغرب کی بنیادی اکائی ہے اور نیٹو جو مغرب کی تہذیبی سلامتی کی تنظیم ہے۔ جیسی مغربی تنظیمیں اپنا دائرہ کار بڑھا رہی ہیں۔

۱۵۰۰ء میں دور جدید کے آغاز کے ساتھ چار سو سال سے زائد عرصے تک مغرب کی ریاستیں برطانیہ، فرانس، جرمنی، اسپین، آسٹریا، پرشیا امریکہ اور دیگر ممالک مغربی تہذیب کے اندر ایک کثیر بین الاقوامی نظام کا حصہ تھے۔ ان میں آپس میں ربط ضبط، سابقت اور جنگیں لڑنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی اقوام نے فتوحات کیں۔ نوآبادیاں قائم کیں اور ہر تہذیب پر فیصلہ کن اثر ڈالا۔ گویا مغرب بیرونی طور پر بھی اور داخلی طور پر بھی طاقت کے ساتھ مصروف بیکار بھی رہا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کمپونزم اور لبرل ازم کے مابین سرد جنگ شروع ہوئی اور یہ دونوں نظریات دو سپر طاقتوں میں ڈھل گئے ان سے وابستہ ممالک امریکہ اور سویت یونین کی قیادت میں دو بلاکوں کی صورت نظریاتی، سیاسی اقتصادی اور بعض اوقات فوجہ مقابلے میں مصروف ہو گئے۔ سویت یونین کی شکست کے ساتھ ہی کمیونسٹ بلاک بھی منہدم ہو گیا۔ اس طرح سرد جنگ کے دوران پیدا ہونے والی دو قطبی دنیا یک قطبی اور ایک طاقتی بن گئی۔ اب امریکہ واحد سپر پقور تھا اور مغرب اسکی زیر قیادت چل رہا تھا۔ چنانچہ اب تہذیب کا مطلب مغربی بین الاقوامی قانون بن گیا۔ عالمی نظام کا مطلب عالمی نظام بن گیا۔

زیادہ تر مغرب کے عروج کا انحصار قوت پر تھا۔ مغرب کا کامیابی کی کلید جنگ لڑنے کی اہلیت تھی۔ جسے فوجی انقلاب کا نام دیا گیا۔ مغرب کی توسیع کو اپنی افواج میں برتری، نظم و ضبط، تربیت میں برتری، ہتھیاروں، ذرائع مواصلات نقل و حمل تیز طبّی خدمات سے بھی مدد ملی جس کا باعث صنعتی انقلاب میں اس کا قائدانہ کردار تھا۔ ۱۹امریکہ مغربی ممالک اور عالمی ادارے تیزی دنیا کے غیر مستحکم ممالک کو قرضے دے کہ انکو محکوم بناتے ہیں اور اپنی مرضی سے ان کی حکومت چلاتے ہیں۔ جہاں امریکہ ان ڈائریکٹ طریقوں میں ناکام ہو جاتا ہے وہاں وہ براہ راست مداخلت کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ مغرب نے سائینسی علوم کے مقابلے میں انسانیاتی علوم کو نظرانداز کر کے جس طرح کی بے روح اور سفاک مشینی معاشرت کو جنم دیا ہے۔ اس میں انسانیت اور

روحانی قدروں کا دم گھنتا جارہا ہے۔ اہل مغرب کے پاس علم تو ہے لیکن انہیں یہ شعور نہیں کہ ان کے اندر خدا نے روح پھونک رکھی ہے۔ اصل میں مغرب خصوصا یورپ اور امریکہ میں اپنے اندر روح کی موجودگی کا شعور تو کیا ہونا تھا ان کے نزدیک تو خدا ہی مر چکا ہے۔ ۳۶ مغربی اقوام فطرت کے عمل میں تو بے حد بلند ہیں لیکن مذہب وانسانیت کی پرائی میں یہ اقوام وہ مقام حاصل نہیں کر سکیں جو انہوں نے طبعی سائنسز میں حاصل کیا ہے۔

اقبال نے اس ترقی کا بڑی نظری سے مطالہ کیا اور محسوس کیا کے یہ قومیں تسخیر کائنات کے علوم میں تو بڑی بلند پرواز کر رہی ہے۔ مگر انسانیت کی پزیرائی میں انہوں نے وہ مقام حاصل نہیں کیا جو طبیعائی سائنسز میں کیا ہے اور اسی وجہ سے وہ قوت کے وسائل پر بڑی حد تک قابض ہیں۔ اس حیثیت نے ان کو کم ترقی یافتہ اقوام کے استحصال پر آمادہ کر دیا ہے۔

دجالی تہذیب:

دجالی تہذیب کی ساری دعوت مادیت پرستی، جنسی لذت اور دنیاہی کو سب کچھ سمجھ کر، اس سے زیادہ سے زیادہ محظوظ ہونے کی ہے۔ چونکہ مسلم ملت دجالی تہذیب کی اس دعوت کو اجتماعی حیثیت سے اختیار کر چکی ہے اور ان کی ریاست کا سارا اجتماعی نظام دجل، مکر، فریب اور مادیت پرستی پر مشتمل ہے۔ اس لیے اب دجال کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلم دنیا اعتقادی طور سے اسلام کے بنیادی عقائد توحید ورسالت کے تصورات سے ہی دستبردار ہونے کا اعلان کرے۔ یعنی دجالی تہذیب کے علمبرداروں کا مسلمان ملکوں اور قوموں سے محض یہ مطالبہ نہیں ہے کہ وہ زندگی کا سارا نقش ونگار اور رنگ ڈھنگ ان کی تہذیب کے مطابق اختیار کریں اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے ان کی غلامی قبول کریں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ اعتقادی طور سے بھی واحدانیت اور رسالت سے دستبردار ہوں اور ان کی زندگیوں سے توحید ورسالت کے عملی مظاہر نہ ہوں، دوسری صورت میں دہشت گردی کا مجرم گردان کر ان پر جنگ مسلط کر دی جائے گی۔

ایک طرف امریکہ میں یہ دولت قارون ہے، موٹروں کی فراوانی ہے، کالجوں کی کثرت ہے، یونیورسٹیوں کی افراط ہے، تعلیم کی ترقی ہے، تجارت کی گرم بازاری ہے، سربفلک عمارتیں ہیں، سامان عیش کی ارزانی ہے، روپیہ کی ریل پیل ہے اور دوسری طرف علم وتعلیم، تہذیب وتمدن، حکمت ودانش کی اس "دنیا" میں انسان کے جسم وجان پر جو کچھ گزر رہی ہے اس کی روئیداد بھی اسی گواہ کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جو نہایت سنگین وہولناک بلکہ شیطانی جرائم کے ارتکاب کی خبریں، امریکہ کے اخبارات میں نہ چھپتی رہتی ہوں۔

صنف نازک کی دو نازک پتیاں موٹر پر سوار ہو کر ایک بینک میں داخل ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک صاحبہ پہنچتے ہیں خزانچی کے چہرہ کے سامنے پستول تان کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور دوسری صاحبہ ہر قسم کے زر نقد، نوٹ وغیرہ سے آناً فاناً خزانچی کا خزانہ خالی کر کے دونوں موٹر میں بیٹھ کر چشم زدن میں نظروں سے غائب ہو جاتی ہیں۔ شکاگو یونیورسٹی کے دو رئیس خاندان طلبہ آپس میں صلاح کرتے ہیں کہ کوئی اعلیٰ قسم کا جرم کر کے دیکھنا چاہیے۔ اس کے بعد موٹر پر سوار ہو کر نکلتے ہیں، راستہ میں ایک بچہ مل جاتا ہے، اسے بہلا پھسلا کر اپنی موٹر پر سوار کرتے ہیں اور کچھ دیر بعد اس کے سر کا مغز نکال کر اس کے جسم کو ریل کی پٹڑی پر ڈال دیتے ہیں۔ ایک مادر مہربان اپنے دو ہفتے کی عمر کے بچے پر ناخوش ہوتی ہیں کہ وہ کیوں وقت بے وقت رویا کرتا ہے۔ اور محبت مادری کا یہ نادر نمونہ دنیا کے سامنے پیش فرماتی ہیں کہ اس کی کلائیوں اور اس کے حلق کو استرے سے چاک کر ڈالتی ہیں

یہ اتفاقی وانتہائی واقعات نہیں کبھی کبھی ایسے واقعات توہر ملک میں پیش آتے رہتے ہیں بلکہ امریکہ میں ان ہی واقعات وحوادث کی کثرت رہنے لگی ہے۔چنانچہ نیویارک کے ایک جج،الفرڈ، جے ٹالی صاحب خودارشادفرماتے ہیں کہ :

ہمارے ملک پرایک سخت الزام ہے کہ روئے زمین پرسب سے زیادہ جرائم کاوقوع یہیں ہوتاہے۔آپ کومانناپڑے گاکہ یہ بدنامی بالکل حق بجانب ہے۔

چور، اٹھائی گیرے، اچکے، بدمعاش، ڈاکو، رہزن، قاتل، بم انداز، غرض جرائم پیشہ قوموں کی کوئی نوع ایسی نہیں جس کی بہت بڑی آبادی اس مہذب ومتمدن سرزمین پرنہ بستی ہو۔بندوق کااپنی حفاظت کے لیے ہروقت اپنے پاس رکھنااس طرح لازمی ہوگیاہے جس طرح مرداپنے پاس سگریٹ اور عورتیں چہرہ کاپوڈر رکھتی ہیں۔پیدل چلیے توڈرلگاہے کہ کہیں راستہ میں لٹ نہ جائیں۔ریل پرسفرکیجیے تودھڑکاہے کہ کہیں مسلح ڈاکوٹرین کونہ گھیرلیں۔پھر یہ بات نہیں کہ ان جرائم کے لیے کوئی خاص وقت یازمانہ مخصوص ہو، یاکسی خارجی سبب کی ضرورت ہو۔بلکہ یہ مستقل کیفیت ہرموسم میں ، ہرزمانہ میں ، ہراختلاف حال میں برابر قائم رہتی ہے۔

ایک محقق علم الاعداد ڈاکٹرفریڈرک ہوف مین فرماتے ہیں کہ پچھلے ۲۶سال کے اندر تعدادوقوعات قتل دگنی ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ تہذیب وتمدن کی ترقی کے ساتھ ہمارے ملک میں اب یہ نوبت پہنچ گئی ہے کہ کوئی شخص کسی وقت اپنے تئیں خطرہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔قتل کے واقعات ایسی لرزہ انگیز شقاوت اوراس شیطانی ذہانت کے ساتھ انجام پاتے رہتے ہیں کہ حکومت وقت حیران رہ جاتی ہے اورانصاف نہیں ہونے پاتے۔

یہ ہے دنیاکی سب سے زیادہ شائستہ ، سب سے زیادہ متمدن اورسب سے زیادہ جمہوری سلطنت میں حفاظت جان کاسامان۔ جو اسی دنیوی زندگی کوسب کچھ سمجھے ہوئے ہیں اوریہ ہے دنیاکی سب سے زیادہ دولت مند، سب سے زیادہ باثروت اورسب سے زیادہ خوشحال ملک میں حفاظت مال کانقشہ جوسودی کاروبارپراپنامدارارزق قائم کیے ہوئے ہے۔یہ ہے اس تمدن کی پاکیزگی،اس تہذیب کی برتری اوراس معاشرے کی بلندی جس کی جانب آج ہندوستان کو بھی دعوت دی جارہی ہے۔امریکہ کانام اب بھی کئی زبانوں پر ''نئی دنیا'' ہے اورواقعہ بھی یہ ہے کہ اس زمین کی مادی ترقیوں کاہلکے سے ہلکاجلوہ بھی غریب مشرقی دنیاکے لیے ''نئی دنیا'' ہی کاحکم رکھتاہے۔آخرت کی مسرتوں کے لیے نہ سہی روح کی راحتوں کے لیے نہ سہی،جنت کی نعمتوں کے لیے نہ سہی کیااسی عالم گل،اسی کائنات مادی،اسی دنیائے سوت کی سہولتوں اورآسانیوں کے لیے، جان ومال کی حفاظت کے لیے آرام واطمینان کے لیے، دل کے چین اورجی کے سکھ کے لیے بھی ''نئی دنیا'' کوباوجوداپنی کوٹھیوں اور ساہوکاریوں کے باوجوداپنی سائنس اوراپنے آرٹ کے باوجود ، اپنی عقل وحکمت کے باوجود ، اپنی حکومت وسیاست کے ''پرانے دین'' کی جانب جھکنے پر مجبور ہوناپڑے گا؟

جس قوم کاخوداپنے ساتھ یہ سلوک ہو وہ غیروں اورپھراپنے غیرمتمدن محکوموں کے ساتھ جس قسم کاسلوک روارکھے گی اس کااندازہ بخوبی کیاجاسکتاہے۔تاہم ترقی وتمدن وکمال شائستگی کایہ مرقع بے آب ورنگ رہ جائے گا؟اگرخاتمہ پراس سلوک کی ہلکی سے جھلک نہ دکھائی جائے جویہ حریت دوست، جمہوریت نواز ومساوات پرست اپنے ہمسایہ حبشیوں (نیگرو) سے روارکھتی ہے۔ان بدنصیبوں کاقتل انتہائی شقاوت ، سفاکی ، بے دردی کے ساتھ اس متمدن قوم کے نزدیک بالکل

جائز ہے۔اور جن عجیب وغریب ہولناک طریقوں پر یہ قتل عمل میں لائے جاتے ہیں ان کے لیے انگریزی میں ایک خاص اصطلاح)Lynching لنچنگ) کی ہے۔

" جیم میکل ہرون کو جس پر دو گورے باشندوں کے خون کا جرم تھا، گذشتہ جمعہ کو لایا گیا اور پہلے لوہے کی دہکتی ہوئی لال انگارہ سلاخ سے داغا گیا اور پھر ساتھ بج کر چالیس منٹ پر شب کو بارہ ڈھانٹے باندھے ہوئے شخصوں نے اسے آگ میں زندہ جلایا۔دو ہزار انسانوں کا مجمع جس میں عورتیں اور بچے بھی تھے، تماشا دیکھنے کے لیے موجود تھا۔

گرفتار کر کے لانے والوں کی جماعت اسٹیشن سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر آگ کا بڑا جنگی الاؤ جلانے گئی اور تماشائیوں کا مجمع بھی ساتھ ساتھ رہا۔مجرم کو ایک درخت کے ساتھ کس کر باندھ دیا گیا اور آگ جلادی گئی۔ذرا ہٹ کر ایک دوسرا الاؤ بھی لگایا گیا اور اس میں لوہے کی سلاخ تپنے کے لیے رکھ دی گئی۔جب خود دہک کر لال انگارہ ہو گئی تو اسے مجرم کے جسم پر چپکانے کے لیے بڑھایا گیا۔مجرم نے بدحواس ہو کر اسے پکڑ لیا اور ساری فضا میں گوشت کے جلنے کی سڑاند پھیل گئی۔مجرم نے جب جا کر اپنی بشریت کا اظہار شروع کیا اور جوں جوں انگارہ بنی ہوئی سلاخ اس کے جسم کے مختلف حصوں کو کو نچتی جاتی تھی، اس کی چیخ پکار، اس کی بے قرارانہ درخواست ہائے رحم سے ساری فضا گونجتی جاتی تھی اور شہر تک اس کی بے تابانہ فریادوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ کئی منٹ تک اس عذاب کے جاری رکھنے کے بعد ایک ڈھاٹا باندھے ہوئے شخص نے اس کے پیروں اور پائجامہ پر تیل چھڑک کر دیا سلائی لگادی۔جب شعلوں نے حبشی کے جسم کو اپنے حلقہ میں لے لیا تو وہ یہ التجا کر رہا تھا کہ اس پر ترس کھا کر فوراً گولی سے ہلاک کر دیا جائے۔اس درخواست کا جواب مجمع نے اپنے نعرہ طنز و تمسخر سے دیا۔اس کے بال جلنے لگے اور اس وقت اس کے ہوش وحواس باقی تھے۔

کیا اب بھی سفاکی وبے دردی، شقاوت ودرندگی کی انتہائی مثالیں پیش کرنے میں نیرو، چنگیز، ہلاکو و نادر ہی کے نام لیے جائیں گے؟افغانی وسرحدی قبائل کی شقاوت وسنگدلی کی داستانیں سرکار برطانیہ کے ہواخواہوں کی زبانی اکثر سننے میں آتی رہتی ہیں۔ کیا اب بھی وہ پھیکی اور بے مزہ نہ معلوم ہوں گی؟

"ہر سال ہمارے ہاں کے تقریباً ۲۰ ہزار نوجوان یعنی ۱۴، ۱۶ اور ۲۰ سال کے درمیانی عمر والے اور والیاں ہمارے اصلاح خانوں میں داخل ہوتے ہیں۔ان میں ۹۲ فی صدی سے اوپر لڑکے ہوتے ہیں اور باقی لڑکیاں۔ان ۲۰ ہزار میں سے کوئی ۱۰ فی صدی شہر کی یا ریاست کی جیلوں میں بند کر دیے جاتے ہیں۔اور یہ تعداد ہر مہینہ بلکہ ہر روز بڑھتی ہی جاتی ہے اور اسی آبادی کے سینے غصہ ، عناد، مایوسی، انتقام کے جذبے سے بھرے ہوتے ہیں۔

خلاصہ ونتائج

(۱)۔برصغیر میں مغربی فکر کا آغاز وارتقاء ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہوا۔

(2)۔برصغیر میں فکر مغرب کے مطالعہ کا سبب انگریزی استعمار کا مسلمانوں کے عقائد ومذہب میں مداخلت تھی۔

(3)۔مغربی فکر کے منفی پہلوؤں میں تعصب، ناانصافی، عدم برداشت، اسلاموفوبیا، دہشت گردی اور حسد قابل ذکر ہیں۔

(4)۔مسلم مفکرین میں ڈاکٹر محمود احمد غازی، ڈاکٹر علامہ اقبال، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا زاہد الراشدی نے تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا ہے۔

(5)۔ مغرب کا دور عروج ایک طرف ٹیکنالوجی کی ترقی کا دور تو دوسری طرف ظلم وزیادتی، جبر وتشدد سے عبارت ہے۔

(6)۔ مغربی تہذیب مادیت پرستی اور روحانی واخلاقی اقدار سے بغاوت کا مظہر ہے۔

سفارشات

عصر حاضر کے معروضی حالات میں فکر مغرب کے حوالے سے علامہ اقبال ، ڈاکٹر حمید الدین ، ڈاکٹر محمد امین ، ڈاکٹر محمد آصف ، ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری ، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دیگر مسلم مفکرین کی آراء کا تفصیلی و تحقیقی مطالعہ وقت کی اہم ضرورت ہے؛ تاکہ ان کی آراء کی روشنی میں امت مسلمہ نئے چیلنجز کو سمجھ کر ان کا بھرپور انداز میں مقابلہ کر سکے۔

قومی سطح پر میں کالجز اور یونیورسٹیوں کو مطالعہ فکر مغرب کو بطور مضمون نصاب کا حصہ بنانا چاہیے۔

مقالہ ہذا میں جن مسلم مفکرین کی آراء کو پیش کیا گیا ہے ان کے دیگر پہلوؤں پر بھی پی۔ایچ۔ڈی کی سطح پر مزید تحقیق ہونی چاہیے۔

آج کل میڈیا کا دور ہے اور مغرب میڈیا وار کے ذریعے اسلام اور اسلامی تشخص کو مٹانے کے درپے ہے۔ ہمیں میڈیا ہی کے ذریعے الیکٹرانک بالخصوص سوشل میڈیا کے پلیٹ فارم سے اسلامی اور مشرقی روایات کو، اسلامی تہذیب وتمدن اور ثقافت کو اجاگر کرنا چاہیے۔ جب کہ فکر مغرب کے منفی اور مسموم پروپیگنڈے کا رد کرنا چاہیے اور اس کی اصلیت، اثرات اور نتائج کو واضح کرنا چاہیے۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

حوالہ جات (References)

[1] غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، اسلام اور مغرب موجودہ صورت حال، امکانات، تجاویز، اہتمام: دار العلم والتحقیق برائے اعلیٰ تعلیم و ٹیکنالوجی: ناشر زوار اکیڈمی پبلی کیشنز کراچی، ۱۵ نومبر ۲۰۰۷ ص ۹، ۱۰، ۱۱

[2] ایضاً ص ۲۲

[3] عزیز احمد، پروفیسر، ،بر صغیر میں اسلامی جدیدیت، ترجمہ، جمیل جالبی، ڈاکٹر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۹۷ء، ص ۱۹، ۲۰

[4] ظفر حسن، ڈاکٹر، سر سید اور حالی کا نظریہ فطرت، ادارہ ثقافت اسلامیہ ل، لاہور ۱۹۹۰، ص ۱۵

[5] عزیز احمد، پروفیسر، ،بر صغیر میں اسلامی جدیدیت، ترجمہ، جمیل جالبی، ڈاکٹر، ص ۳۲تا۴۰

[6] عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، اقبال اور جدید دنیائے اسلام، ص ۳۰۷

[۷] عزیز احمد، پروفیسر، برصغیر میں اسلامی جدیدیت، ترجمہ، جمیل جالبی، ڈاکٹر، ص ۲۵

[۸] ہاشمی، فرید آبادی، تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت (جلد دوم) انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۳ء، ص ۲۳۳

[۹] بھٹو، محمد موسیٰ، معاشرہ، جدیدیت اور اسلام، سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، ص ۱۶

[۱۰] Crover,B.L,&Sethi,R.R,"Studies in Modern India",S,Chand and Co,Delhi, 1963,PP,271,276

[۱۱] Crover,B.L,&Sethi,R.R,"Studies in Modern India",PP,271,272

[۱۲] Ibid, PP.4

[۱۳] Ibid, PP272,273,7

[۱۴] منگلوری، طفیل احمد، "مسلمانوں کا روشن مستقبل" مطبع علیمی، دہلی ۱۹۴۵ ص ۱۵۰

[۱۵] ظفر حسن، ڈاکٹر، سر سید اور حالی کا نظریہ حیات، ص ۴۹ تا ۵۷

[۱۶] عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، اقبال اور جدید دنیائے اسلام، ص ۳۰۸، ۳۰۷

[۱۷] طفیل احمد، منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۱۵۰، ۱۵۱

[۱۸] عزیز احمد، پروفیسر، برصغیر میں اسلامی جدیدیت، ترجمہ، جمیل جالبی، ڈاکٹر، ص ۴۵ تا ۵۲

[۱۹] ایضاً ص ۴۱ تا ۴۵

[۲۰] عبدالعزیز، شاہ، فتاویٰ عزیزی، ترجمہ، عبدالواحد، مولوی، ص ۴۲۱ تا ۴۲۳، ۵۵۶، ۵۵۷

[۲۱] مہر، غلام رسول، جماعت مجاہدین، کتاب منزل، لاہور، سن ندار، ص ۴۱ تا ۴۵

[۲۲] بھٹو، محمد موسیٰ، معاشرہ، جدیدیت اور اسلام: سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، ص 14/100

[۲۳] عزیز احمد، پروفیسر، ہندو پاک میں اسلامی کلچر، ترجمہ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۱ ص ۲۷۹ تا ۲۸۹

[۲۴] ایضاً ص ۴۹

[۲۵] ایضاً ص ۵۰

[۲۶] عسکری، محمد حسن، جدیدیت کا آغاز، ادارہ مطبوعات طلبہ لاہور۔ اشاعت ۲۰۱۳ ص ۴۰، ۳۹

[۲۷] ایضاً ص ۵۴

[۲۸] اصلاحی، صدرالدین، مولانا، معرکہ اسلام و جاہلیت: مرکزی مکتبہ اسلامی، پبلشرز۔ نئی دہلی ۲۵ فروری ۲۰۰۸ ص ۱۶۹

[۲۹] ایضاً

[۳۰] ایضاً ص ۱۷۱

[۳۱] اصلاحی، صدر الدین، مولانا، معرکہ اسلام و جاہلیت: مرکزی مکتبہ اسلامی، پبلشرز۔ نئی دہلی ۲۵ فروری ۲۰۰۸ ۔ ص ۲۰۴، ۲۰۳

[۳۲] ایضاً ص ۲۱۱